© rasailojaraid.com

غلام ربانی آگرو

شاہ عبداللطیف بھٹائی

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

سندھ کرۂ ارض پر خوش نصیب خطوں میں شمار ہوتا ہے، جہاں ہزار ہا برس پہلے انسانی تہذیب کے اولین پھول مسکرائے تھے۔ سندھ کی موجودہ صوبائی حدود برطانوی دور حکومت میں متعین ہوئی تھیں۔ قدیم عربی تاریخوں میں ہمیں جس "السند و الھند" کا ذکر ملتا ہے اس کی سرحدیں بہت وسیع تھیں۔ یہ تو معلوم نہیں ہے کہ دنیائے اسلام کے نامور شاعر جلال الدین رومی نے کس پس منظر میں فرمایا تھا کہ:

ھندیاں را اصطلاح ھند مدح
سندیاں را اصطلاح سند مدح

لیکن اگر زبان کو تہذیبی اثرات کا ایک موثر پیمانہ قبول کیا جائے تو یہ بات ذھن نشین کرلینی چاہیے کہ موجودہ دور میں بھی سندھی زبان کی پرچھائیاں اپنی صوبائی سرحدوں کو پار کر کے مشرق میں صحرائے راجستھان اور مغرب میں بولان کے پہاڑوں پر پڑتی ہیں، سبی، ڈھاڈر، خضدار، لسبیلہ اور بلوچستان کے دیگر مقامات میں سندھی زبان اس طرح صاف بولی جاتی ہے، جس طرح خود سندھ کے ساحلی علاقے کے شہروں کنڈیارو، مورو اور نوشہرو فیروز میں۔ چنانچہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈھاڈھر کے قرب و جوار میں مہرگڑھ کے سات ہزار سالہ پرانے کھنڈرات درحقیقت وادی سندھ کی قدیم تہذیب کے اولین نقوش ہیں۔

وادی سندھ کی تہذیب دریائے سندھ کی دین ہے۔ ہندکو (سندھکو؟) لہٰذا' ڈیرہ والی' پنجابی' سرائیکی' ملتانی اور سندھی میں بیشمار مشترکہ الفاظ پائے جاتے ہیں' جو ایک ہی معنی اور مفہوم میں مری کی پہاڑیوں سے ساحل سمندر تک روز مرہ استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ ہر علاقہ میں ان کا تلفظ قدرے بدلتا جاتا ہے۔ ان قدیم زبانوں میں یہ قدر مشترک کسی اہم رشتے کی غمازی کرتی ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں وادی سندھ میں نہ معلوم کتنے شہر اور تہذیبی مرکز آباد ہوئے اور اجڑ گئے۔ مھن جو دڑو (مھن کا ٹیلہ) اور ہڑپہ کی دریافتوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہزارہا برس پہلے دنیا کے بیشتر علاقے جب تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے' تو وادی سندھ میں لکھنے پڑھنے کا رواج تھا۔ ایسی زبان میں منطقی طور پر شعر و ادب کا ذخیرہ بھی اتنا ہی قدیم ہونا چاہیے۔ لیکن زمانے کے دستبرد کی وجہ سے قدیم دور کی تحریریں یوں ضائع ہوگئیں کہ اب ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ مھن جو دڑو سے جو نوشتے برآمد ہوئے ہیں' ان کو اب تک پڑھا نہیں جاسکا۔ طلوع اسلام کے بعد ایسی تحریریں دریافت ہوئی ہیں جن سے اس دور میں سندھ کی پختہ علمی روایت کا ثبوت ملتا ہے۔ ابن بطوطہ جب سندھ میں آیا تو عربی اور سندھی دونوں زبانیں رائج تھیں۔ باور کیا جاتا ہے کہ حکمران طبقہ کی زبان عربی اور عوام کی سندھی ہوگی۔ کچھ اہل قلم عربی میں تو کچھ سندھی میں تصنیف و تالیف کرتے ہوں گے۔

روایت ہے کہ دیبل کے ایک عالم نے "مکاتیب النبیؐ" کے نام سے حضور ﷺ کے خطوط کا دنیا بھر میں اولین مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا ایک نسخہ دمشق کے کتب خانہ "ظاہریہ" میں موجود ہے۔ سندھ کے عربی دارالخلافہ منصورہ کے ایسے متعدد سندھی علماء کا کتابوں میں ذکر آیا ہے جنھوں نے قرآن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور حدیث کے علوم میں ناموری حاصل کی۔ بزرگ بن شہریار نے اپنی تصنیف "عجائب الہند" میں منصورہ کے ایک عالم دین کا ذکر کیا ہے، جس نے کشمیر کے راجا کو قرآن پاک کا ترجمہ سنایا تھا۔

قرآن مجید کو خود قرآن نے "کتاب" کہا ہے۔ لیکن اس کے اسلوب کو نثر یا نظم کی کسی بھی صورت سے تعبیر کرنا درست نہیں ہوگا اس لیے کہ قرآن آسمانی صحیفہ ہے، یکتا ہے، بے مثل ہے۔ حضور ﷺ کی کئی احادیث اپنے مفہوم کے علاوہ عربی زبان کے اسلوب بیاں کے حوالے سے لعل و گوہر ہیں لیکن ان کو بھی ادب کے کسی مروج سانچے میں نہیں ڈھالا جاسکتا۔ عربوں میں دور جہالت میں شاعری کا عام رواج تھا لیکن طلوع اسلام کے بعد اس کی نوعیت یوں بدل گئی کہ اس نے خدا کی وحدانیت اور پیغمبر کی رسالت کے نقیب کا کام کیا۔ چنانچہ سندھ میں قرآن اور حدیث کے علوم میں ناموری حاصل کرنے والے علماء کو خالص ادبی حوالے سے کسی زمرے میں ڈالنا مناسب نہیں ہوگا۔

اسلامی روایت میں ادب کی آبیاری غالباً اسلامی تصوف نے کی۔ یوں تو ابتدائی صوفیانہ ادب بھی احادیث سے مزین ہے لیکن کچھ صوفیاء سے ایسے اقوال صادر ہوئے ہیں جو چونکا دینے والے ہیں۔ ان صوفیاء میں بایزید بسطامی (وفات ۸۷۵ء) سرفہرست ہیں۔ جنھوں نے فرمایا تھا کہ "سبحانی ما اعظم شانی۔ ان اقوال کی بعد میں تاویل کی گئی اور کہا گیا کہ اگر ان کو عمیق نگاہ سے دیکھا جائے تو روحانیت سے لبریز ہیں:

من نمی گویم اناالحق یار می گوید بگو
چوں نمی گویم ،مرا دلدار می گوید بگو

بعد کے اسلامی تصوف نے عوام تک اسلامی تعلیم کی پیغام رسانی کے لیے ادبی لحاظ سے قوس و قزح کی شکل اختیار کرلی۔ اس کی نشرو اشاعت میں بلاشبہ فارسی زبان نے اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شارح ڈاکٹر گر بخشانی کا خیال ہے:

"تصوف عربوں سے زیادہ ایرانیوں کی طبع کے موافق تھا۔ ایران کی زمین "اناالحق" کے بیج کے لیے سیراب ہو چکی تھی۔ تصوف یہاں پھلا پھولا اور شعر و شاعری کے خوبصورت پھول مسکرائے۔ تصوف فارسی شعر کا گویا تانا بانا بن گیا۔ نامور شعراء عطار، سنائی اور رومی نے تصوف کے فلسفے اور الہیات کو اپنے شعر میں تمثیلی لباس پہنایا۔"

سندھ نے اسلامی تصوف کا بھرپور اثر قبول کیا۔ اس کی بنیادی طور پر دو وجوہات تھیں۔ ایک طلوع اسلام سے پہلے سندھ میں برھمن حکومت کا تشدد، دوسری برہمن حکومت سے پہلے سندھ میں بدھ مت کا پیغام محبت۔ اس تاریخی پس منظر میں سندھی زبان کی کلاسیکی شاعری آج اسلامی تصوف کا ایک ایسا خوشنما منظر پیش کر رہی ہے جہاں چاروں طرف سدا بہار پھول مہک رہے ہیں، تاہم اس چمن کے گل سرسبد شاہ عبداللطیف بھٹائی ہیں۔

بیرون سندھ شاہ کو سندھی زبان کا عظیم ترین شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن خود سندھ کے اندر آپ کی بنیادی پہچان ایک ولی اللہ کی ہے۔ پیر پاگارہ کے روحانی خاندان کے مشہور ترین بزرگ پیر سید محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۱۷۰ھ) کے ملفوظات شریف میں عبدالرحیم گرھوڑی اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ذکر بار بار آتا ہے۔ پیر سید محمد راشد دونوں بزرگوں کو عارف باللہ قرار دیتے ہیں۔

گرھوڑی بھی شاہ کی طرح شعر کہتے تھے۔ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں:

اعلیٰ اور ارفع ہیں شاہ عبداللطیف بھٹائی
ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے
خداوند کریم ان پر راضی ہوا
آپ نے سندھی زبان میں قرآن منتقل کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مغربی مبصر نے تاج محل کو دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ "اس دنیا کی آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک وہ حصہ جس نے تاج محل دیکھا ہے۔ دوسرا وہ جس نے اب تک نہیں دیکھا۔"

اسی انداز سے سندھی ادب کو بھی دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک شاہ سے پہلے' دوسرا شاہ کے بعد۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھ کا ہزاروں برس تہذیبی سفر بھی شاہ کے بغیر نامکمل ہے۔ شاہ کی متبرک ذات ہی میں سندھ کی تہذیب اور ثقافت اپنے نقطہ عروج (Crowning Point) کو پہنچی۔

والٹ و ٹمئن کا قول ہے کہ "عظیم شاعر کی ایک پہچان یہ ہے کہ جس شدت سے اس نے اپنے عوام سے محبت کی ہے اس کے اپنے عوام نے بھی ویسی ہی والہانہ عقیدت سے اسے اپنایا۔

اس بات کو اگر کلیہ قرار دیا جائے تو بین الاقوامی منظر پر بھی ایسے شعراء جیسی قدآور شخصیتیں کم نظر آئیں گی جو اپنے خواص اور عوام میں شاہ کی طرح ہردلعزیز ہوں۔

ہر سندھی باشندے کے لیے یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جب وہ نوزائدہ بچہ تھا تو شاہ کا کلام اسے اپنی ماں کے دودھ میں ملا تھا۔ سندھ کے لوگ جہاں ہوں' جیسے ہوں' شہروں کے شرفاء ہوں یا مویشیوں کے چرواھے' مغرب کی یونیورسٹیوں سے علم کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے والے دانشور ہوں یا حروف سے مطلقاً" ناآشنا لوگ' فاقہ کش مساکین ہوں یا صاحب ثروت امراء ہوں حتیٰ کہ ہندو ہوں یا مسلمان--- شاہ کا کلام رنگ' نسل' مذہب اور طبقاتی کشمکش کی تفریق سے قطع نظر ہر سندھی کے دل کی دھڑکن ہے۔

سندھ کا کوئی قصبہ' کوئی شہر' کوئی علاقہ ایسا نہ ہوگا جو شاہ کے عقیدت مندوں سے خالی ہو' جہاں شاہ کا کلام نہ گایا جاتا ہو' لیکن آپ کی ابدی آرام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گاہ "بھٹ شاہ" پر گزشتہ دو صدیوں سے ہر جمعرات کو عشاء کی نماز سے فجر کی اذان تک آپ کا کلام بطور عبادت گایا جاتا ہے۔

شاہ کا روضہ اور اس سے ملحق مسجد سندھ میں اسلامی طرز تعمیر کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ ان کی تعمیر کی سعادت سندھ کے تاجدار غلام شاہ کو نصیب ہوئی، جو ایک بڑے فاتح اور انصاف پسند حاکم کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ غلام شاہ نے روضہ کی خوبصورتی کے لیے اس کو کاشی کی اینٹوں سے مزین کیا اور چاندی کا دروازہ لگوایا۔ صحن میں سنگ مرمر اور سنگ سیاہ کا فرش بچھوایا۔

جب رات کے سائے ڈھلنے لگتے ہیں تو قرب و جوار سے آئے ہوئے شاہ کے عقیدت مند صحن میں جا بجا بیٹھ جاتے ہیں۔ شاہ کے فقراء سیاہ رنگ کا مخصوص لباس اوڑھ کر تانپورے کی طرز پر بڑے بڑے ساز کندھوں پر رکھ کر ایک دائرہ بنا لیتے ہیں۔ کچھ دیر تک سازوں کے تار چھیڑتے رہتے ہیں۔ جب سر اور تار مل جاتے ہیں تو فقراء صدا بلند کرتے ہیں۔ اچانک ایک عجیب طلسماتی منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے فضا میں نور کی مشعلیں بلند ہو گئی ہوں اور شاہ کا کلام چاندنی سے بھرے ہوئے دریا کی طرح بہہ رہا ہو۔ چاروں اطراف سناٹا چھا جاتا ہے۔ صرف سامعین کی ٹھنڈی سانسیں سنائی دیتی ہیں۔ بعض کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے، جس سے ان کے دکھ درد ہلکے ہو جاتے ہیں۔

شاہ نے صرف سندھی میں شعر کہا۔ ویسے ان کے زمانے میں سندھ میں فارسی گو شعراء کا بول بالا تھا۔ سندھی ادبی بورڈ نے ان کی تقریباً تین کلیات شائع کر دیئے ہیں۔ شاہ خود فارسی زبان کے عظیم شعراء رومی اور حافظ کے کلام سے شغف رکھتے تھے: سفر اور حضر میں قرآن مجید کے علاوہ دو کتابیں ساتھ رکھتے تھے۔ ایک اپنے دادا شاہ کریم کا کلام اور دوسری مثنوی مولانا روم۔ محققوں نے شاہ کے کلام کے جو قدیم نسخے دریافت کیے ہیں ان میں سے ایک کا تو آغاز ہی مثنوی کے شعر سے ہوتا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

اسی طرح آپ کے کلام میں حافظ کے مصرعے بھی ملتے ہیں۔ تاہم شاہ نے نہ صرف فارسی میں شعر کہنے سے گریز کیا بلکہ فارسی گو سندھی شعراء پر طنز کی۔

تاریخ نویسوں کا خیال ہے کہ جب مغلوں نے ہند پر قبضہ کیا تو ان کا ایک خانوادہ (ارغون اور ترخان) سندھ پر قابض ہوگیا۔ فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ ارغونوں، ترخانوں اور مغلوں نے مسلمان ہونے کے باوجود سندھ کے عوام پر بے انتہا مظالم ڈھائے، جن کی تفصیل "بیگلارنامہ" اور اس عہد کی دیگر تاریخوں میں موجود ہے۔ پہلے مخدوم بلاول جیسے اہل اللہ کو شہید کیا اور بعدازاں صوفی شاہ عنایت کو۔ اس تاریخی پس منظر میں بعض لوگ سندھ کے فارسی گو شعراء کے خلاف شاہ کے ردعمل کو ایک باشعور فنکار کا احتجاج قرار دیتے ہیں۔

لیکن شاہ کے ایک مغربی شارح ڈاکٹر رسولے نے اپنی شہرہ آفاق انگریزی تصنیف "شاہ عبداللطیف بھٹائی" میں خیال ظاہر کیا ہے کہ جب اورنگزیب نے وفات پائی تو شاہ اٹھارہ برس کے تھے۔ سیاسی اقتدار مغل خاندان سے مقامی طاقتور سندھی قبیلے کلہوڑہ کو منتقل ہو رہا تھا۔ برصغیر ایک سیاسی تلاطم میں مبتلا تھا۔ سندھ اس سے متاثر ہوچکا تھا۔ لیکن شاہ ان سیاسی تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس تناظر میں وہ ہمیں مغربی مفکروں کانٹ، اور ہیگل کی یاد دلاتے ہیں، جنہوں نے اپنے اردگرد ہونے والے سیاسی واقعات کا بظاہر کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

سورلے کا خیال ہے:

"شاہ ہمہ وقت انسانی زندگی کے ان بنیادی مسائل میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مستغرق رہتے تھے جو لافانی شعر کے لیے بہتر موضوعات فراہم کرتے ہیں۔ شاہ جیسے عظیم شاعر کو مغل اور کلہوڑہ خاندانوں کی محلاتی سازشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

شاہ کے سیاسی اور سماجی رویوں کے بارے میں ایک بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی تمام دلچسپی' ہمدردی اور محبت سندھ کے مفلوک الحال عوام سے تھی' جو ایک طرف جاگیردارانہ ماحول کی چکی میں اپنے ہی ابن الوقت سندھی امراء کے ہاتھوں پس رہے تھے' تو دوسری جانب ظاہر میں کلمہ گو' مگر باطن میں بھیڑیوں سے بدتر ارغون اور ترخان لٹیروں کے ظلم و تشدد کا نشانہ تھے۔"

غالبًا ہر عظیم شاعر کا اپنے اپنے دور میں یہی سیاسی اور سماجی رویہ رہا ہے۔ پشتو کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک نے بھی مغلوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ علامہ اقبال نے ان کے باغیانہ جذبے کو سراہتے ہوئے کہا ہے:

مغل سے کسی طرح کمتر نہیں
قہستان کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند

شاہ کو سندھ کے عوام اور مٹی سے اس قدر محبت تھی کہ ایک جگہ فرماتے ہیں: "قدرت نے میری سانس میرے عوام کے ساتھ باریک سوئی سے سی لی ہے۔"

یہ کیفیت شاہ کے کلام میں ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن اس کی ایک خوبصورت مثال سر مارئی ہے جو سندھ کے ریگستانی علاقے کی عوامی داستان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اس علاقے کو سندھی زبان میں تھر کہا جاتا ہے۔ تھر میں بسنے والے عام لوگوں کو روزمرہ زندگی میں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ پینے کا پانی ہے۔ تھر میں کسی دریا' نہر یا جھیل کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کنوؤں کا پانی کڑوا بھی نکل آتا ہے۔ میٹھے پانی کا دوسرا ذریعہ ایسے تالاب ہیں جن میں بارش کا پانی جمع ہو اور کافی عرصہ تک کام آئے۔ نوجوان بچیاں اور عورتیں تین تین مٹکے سر پر اٹھا کر طلوع آفتاب سے پہلے پانی کے لیے چلی جاتی ہیں۔ میلوں چل کر وہ کسی تالاب یا کنویں پر پہنچتی ہیں۔ وہاں اپنی باری آنے کا انتظار کرتی ہیں۔ جب پانی ملتا ہے تو بھرے ہوئے مٹکوں کے بوجھ سے واپسی کے سفر میں ان کا آدھا دن گزر جاتا ہے۔ بعض اوقات شام سویرے غروب آفتاب سے پہلے پھر ان کو یہی عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔ یوں پیاس مٹانے کے لیے ریت پر چلتے چلتے ان کی زندگی گزر جاتی ہے۔

لوگ زندگی بسر کرنے کے لیے مویشی پالتے ہیں۔ پانی کی تلاش میں مویشیوں کے ساتھ دور دور نکل جاتے ہیں۔ لیکن اگر بارش نہ ہو تو انسان اور جاندار دونوں کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تھر دوزخ بن جاتا ہے۔

تھر کا موسم بہار وہی ہوتا ہے جس میں بارش ہو۔ کثرت آب سے ریت پر کئی قسم کے خود رو پودے نکل آتے ہیں۔ جہاں تک نگاہ جاتی ہے سبزہ زار نظر آتے ہیں اور ان کے درمیان ادھر ادھر پانی کے چھوٹے بڑے تالاب' تھر کے لوگ مویشی لے کر میدانوں میں نکل آتے ہیں۔ خیمے لگ جاتے ہیں۔ نغمے اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ وہی ریگستان جو پہلے دوزخ کا منظر پیش کر رہا تھا اب باغ بہشت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

شاہ نے تھر کے ان مناظر کو اپنے لافانی کلام میں امر کر دیا ہے اور فرمایا ہے:

"جب میں مر جاؤں تو میرے جسم کو تھر کی ٹھنڈی ریت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ڈھانپنا، کسی خوشبودار چیز کی بجائے تھر کے خشک گھاس
کے دھوئیں سے فضا کو معطر کرنا تو میں مر کر بھی جی اٹھوں
گا۔"

حافظ نے بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں لیکن دوسرے رنگ میں فرمایا تھا:

بر سر تربت من بے می و مطرب منشین
تا ببویت ز لحد رقص کناں بر خیزم

حافظ کی محبوبہ ایک پیکر حسن تھی جسے اس نے "سروناز" سے تشبیہ دی ہے لیکن شاہ کے محبوب سندھ کے مفلوک الحال عوام تھے۔ چنانچہ سرمارئی کا سارا کلام تھر کے عوام کی زندگی، ان کے دکھ سکھ آس اور امید کی داستان ہے۔

شاہ نے اپنے شعر کے موضوعات کے لیے سندھ کے ہر حصے سے عوامی داستانیں منتخب کیں۔ مثلاً سسی پنوں، نوری جام تماچی، مومل رانو، سوہنی مہینوال وغیرہ۔

پھر ان عوامی داستانوں میں بین السطور اپنا آفاقی پیغام دیا:

خوشتر آن باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

شاہ کے پیغام کا مرکزی نقطہ خالق اور مخلوق کا رشتہ ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں انسان کے مطالعہ کے لیے سب سے اہم موضوع خود انسان ہے۔ ایک قدیم چینی مندر کے دروازے پر لکھا تھا کہ "خود کو پہچانو" (Know thy Self) ایک اور روایت ہے کہ یہ الفاظ ڈیلفی میں اپولو کے مندر کے دروازے پر لکھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ یہ مقولہ فیثا غورث سے منسوب کرتے ہیں کچھ سقراط سے۔ اسلامی روایت میں ایسا ایک مقولہ حضرت علیؓ سے بھی منسوب ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"

صوفیا کا خیال ہے کہ خود شناسی انسان کو خداشناسی کے راستے پر لے جاتی ہے۔ شاہ سسی پنوں کی داستان بیان کر رہا ہو یا سوہنی مہینوال کی، وہ بین السطور قاری تک اپنا پیغام پہنچا دیتا ہے:

"قریب آؤ تو سناؤں بہت مخفی ہے میری بات"

شاہ کی زندگی کا بڑا عرصہ سفر میں گزرا! آپ نے ایسے لوگوں کی زیارت کی جن کے لیے خود فرماتے ہیں:

"اے میری ماں! میں نے وہ دیکھے جنہوں نے محبوب کو دیکھا تھا۔ میں ان کی عظمت کی کوئی بات بیان کر ہی نہیں سکتا۔"

روایت ہے کہ شاہ کو خواجہ محمد زمان اور مخدوم معین ٹھٹوی سے ازحد محبت تھی اور اکثر ان ہی سے مجلسیں کرتے تھے۔ اپنے کلام میں ایک جگہ ان مجلسوں کو یاد کر کے فرماتے ہیں:

بھیگی ہوئی رات کے پچھلے پہر میں
دریا کے بھنور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں

ایسی ہی بات ایک مغربی شاعر نے دوسرے انداز میں کہی ہے:

"Peaks of Mountains See Each Other"

شاہ خلوت پسند تھے۔ جنوبی سندھ میں چھوٹے بڑے شہروں سے دور ریت کے ایک ٹیلے (Sand Hill) میں ڈیرہ ڈالا، جہاں کوئی سایہ دار درخت بھی نہ تھا لیکن آپ کی شہرت اس قدر تیزی سے پھیلی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ریت کا ٹیلا اچھی خاصی بستی بن گیا۔ دور دراز علاقوں سے لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اٹھارویں صدی عیسویں میں سندھ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاگیردارانہ جبر سے بھرپور بے رحم معاشرے میں لوگ ایک قلندر کے پاس کیوں کھچے آتے تھے؟

اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ شاہ اہل بیت کی اولاد سے تھے۔ سندھ کے لوگ اہل بیت کا احترام کرتے ہیں۔ پیروں، فقیروں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہوں گے کہ شاہ کی دعا سے ان کے من کی مرادیں پوری ہو جائیں گی۔ لیکن ہمیں کتابوں میں ایسی کوئی روایت نظر نہیں آتی کہ شاہ کی کرامتوں اور معجزوں سے لوگوں کے وارے نیارے ہوگئے۔ ناممکن، ممکن ہوگیا، بلکہ کتابوں میں یہ بھی کہیں نظر نہیں آتا کہ شاہ ایسے عابد اور پرہیزگار تھے کہ اکثر اوقات ورد و وظائف ہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کا ارشاد تو یہ تھا:

صحبت یار بہت بڑی بات ہے
قضا نماز پھر بھی پڑھی جاسکتی ہے

سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انس اور محبت کے ساتھ حسد اور نفرت بھی تو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ خلق خدا کو فقیر سے حسد نہ ہو حاکم وقت تو ایسی کرشمہ ساز شخصیت کو پسند نہیں کرتا جو مقناطیس کی طرح عوام کو اپنی طرف کھینچے۔ چنانچہ والی سندھ میاں نور محمد کو شاہ کی شہرت کی اطلاع ملی تو بھڑک اٹھا۔ لیکن فقیر، بادشاہ سے بازی لے گیا۔ میاں نور محمد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ معافی کا طلبگار ہوا اور صدق دل سے یوں مطیع ہوا کہ اپنے ولی عہد کا نام ہی غلام شاہ رکھا۔ یہ تاریخی حقیقت شاہ کی شخصیت کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

ملفوظات حضرت پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ میں مرقوم ہے کہ ایک دن غلام حسین نام سے ایک مرید آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "حضور شب گذشتہ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، کہ ایک بہت بڑا سانپ مجھے کاٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہا ہے۔"

پیر روشن ضمیر نے فرمایا کہ: "تجھے عشق کا اژدھا ڈس لے گا۔"

شاہ کو بھی عالم شباب میں عشق کے اژدھا نے ڈس لیا۔ انسانی حسن میں شاید پری کے سائے سے زیادہ سحر ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ جیسے حساس دل انسان اگر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔

عشق انسان کو لذت غم سے آشنا کرتا ہے۔ دنیا جہاں سے بلکہ اپنے آپ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ شاہ برسوں تک خانہ بدوش رہے۔ کوہ و بیاباں میں پھرتے رہے۔ کبھی تن تنہا کبھی جوگیوں کے ساتھ۔ آپ کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ آپ نے ' ملتان' راجستھان' صحرائے سندھ' ساحل سمندر اور بلوچستان کے پہاڑوں میں ہر متبرک مقام پر حاضری دی خواہ ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہو یا مسلمانوں کی زیارت گاہ' جوگیوں اور یاتروں کے ساتھ بھوک اور پیاس سے بے نیاز پتا نہیں کہ کتنے پہاڑ اور صحرا پار کیے۔ "ہنگلاج" پر حاضری دی جو بلوچستان میں قدیم زمانے کا ایک اہم مقدس مقام ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مجاز کی سرحدیں کہاں ختم ہوتیں ہیں اور حقیقت کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ لیکن معرفت حق کے لیے جلوت چھوڑ کر خلوت میں جانا بستی چھوڑ کر بن میں جانا' زمانہ قدیم سے عارفوں کا طریقہ رہا ہے۔ گوتم نے کپل وستو چھوڑ کر بن باس اختیار کیا۔ موسیٰؑ مصر سے نکلے اور صحرا میں چلے گئے۔ طور سینا میں حق کا مشاہدہ نصیب ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کعبہ اللہ کی جلوہ گاہ میں نہیں' غار حرا کی خلوت میں حضور ﷺ پر نازل ہوا۔

چنانچہ جب کسی سطح بین شخص نے جوگیوں اور یاتروں پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ یہ سوامی جھوٹے ہیں اور ان کے سفر بے مقصد تو شاہ نے برجستہ جواب دیا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سچے ہیں سوامی اور سچے ان کے سفر
ہر جگہ موجود محبوب ان کو ہنگلاج ہی میں ملا تھا۔

اگر ہم اس مسئلہ کو اپنے عقیدے کے مطابق دیکھیں تو بات شاید واضح ہو جائے گی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خداوند کریم ہر جگہ موجود ہے۔ تاہم کعبتہ اللہ کا حج ہم پر فرض ہے۔ اب تو آبی اور ہوائی جہاز ایجاد ہوگئے ہیں۔ قدیم زمانے میں خود ہمارے آباء و اجداد صحراؤں اور بیابانوں کو پیدل پار کر کے حج کرتے تھے۔ بروس چٹوں نے اس لیے تو کہا تھا:

> "There was an idea particularly in the middle ages that by going on pilgrimage as Muslim pilgrims do, You were reinstating the original condition of man. The act of Walking through a wilderness was thought to bring you back to God."
>
> Bruce Chatwin
>
> The Song Lines

آسمان میں سب تارے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ چودھویں کا چاند دیکھ کر سبھی بچے اس کی تمنا کرتے ہیں۔ لیکن ہزاروں میں کوئی ایک ایسا خوش بخت ہوتا ہے کہ قدرت واقعی اس کی گود میں چاند ڈال دیتی ہے۔ شاہ ایسے خوش بخت تھے۔

برسوں کی صحرانوردی کے بعد جب وطن لوٹے تو اپنے اور پرائے سب آپ کی راہ تک رہے تھے۔ مغلوں کا وہ طاقتور قبیلہ جن کی دوشیزہ سے لو لگا کر اپنے اور پورے خاندان کے لیے دشمنی مول لی تھی، اپنے کئے پر سخت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نادم تھا۔ شاہ کی آمد کی خبر سن کر خوش ہوا۔ پیش خدمت ہوا' شاہ کی من کی مرادیں پوری ہوئیں۔ اسی پری پیکر سے عقد ہوا جو آپ کے خوابوں میں چاند بن کر چمکتی تھی۔

یہ شعر پتہ نہیں کہ آپ نے کس زمانہ میں کہا:

آنگن میں تازی گھوڑے ہوں
صحن میں دودھ بھری بھینسیں ہوں
میدان میں خیمے ہوں' باہر موسلادھار بارش ہو
خوشبو سے معطر بستر ہوں' پہلو میں یار ہو
کاش! ہم دونوں کی زندگی کے دن برابر ہوں

شاہ کے فقراء' بی بی صاحبہ کو ادب سے "تاج المخدرات" کہتے تھے۔ شاہ کی آپ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ لیکن شاہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میری اولاد میرے فقراء ہیں۔ روایت ہے کہ جب شاہ نے رحلت فرمائی تو کئی فقراء آپ کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کرسکے' فوت ہوگئے۔

شاہ کی زندگی' کلام اور پیغام پر صحیح معنوں میں تحقیقی کام برطانوی دور حکومت میں شروع ہوا۔ اس کا آغاز تالپور خاندان کے آکری تاجدار' میر عبدالحسین نے کیا جو خود ایک عظیم شاعر تھے۔ "سانگی" تخلص کرتے تھے۔ شادی ایک انگریز میم سے کی اور عشق ایک سندھی حسینہ سے۔ سانگی نے شاہ پر فارسی میں "لطف اللطیف" نام سے کتاب لکھی جو اب شائع ہوچکی ہے۔

لیکن شاہ پر صحیح معنوں میں مستند کتاب "Shah Abdul Latif of Bhit" کے نام سے ایک مغربی محقق ایچ۔ ٹی۔ سورلے نے لکھی۔ موصوف نے اس میں اٹھارویں صدی عیسویں میں سندھی معاشرے کا سیاسی' سماجی اور معاشی جائزہ لیا اور اس تناظر میں ایک باکمال شاعر کے ابھرنے کا مطالعہ کیا۔

سورلے برطانوی دور حکومت میں سندھ میں آئے تو آئی۔ سی۔ ایس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عملدار کی حیثیت سے لیکن بنیادی طور پر وہ دانشور تھے۔ D.Litt تھے۔ لسانیات اور ادبیات کا مطالعہ آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مادری زبان انگریزی تھی لیکن بامحاورہ سندھی بولتے تھے۔ عربی سے ایسی عقیدت تھی کہ اسے "Noblest Language" کہتے تھے۔ سندھ سے ریٹائرمینٹ سے پہلے آپ نے سنہ ۱۹۵۲ء میں ایک اور کتاب لکھی جس کا نام تھا "Musa Parvagunis" یہ کتاب ایک سال بعد سنہ ۱۹۵۳ء میں "Aberdeen University Press" سے شائع ہوئی۔ لندن سے اس کی ایک کاپی مرحوم حفیظ ہوشیارپوری اپنے دوست پیر حسام الدین راشدی کے لیے لائے تھے۔ پیر صاحب نے کچھ عرصہ کے لیے مذکورہ کتاب مجھے عاریتاً عنایت کی۔ اب سورلے کی پہلی کتاب تو دوبارہ چھپ گئی ہے اور مارکیٹ میں موجود ہے لیکن دوسری کتاب نایاب ہے۔ ایک نسخہ جناب کریم بخش خالد کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ سورلے نے اس کتاب میں دو ہزار برس کی عالمی غنائیہ شاعری کا ایک انتخاب پیش کیا ہے۔ سورلے غنائیت کو شاعری کے لیے لازم قرار دیتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے:

"Now all my life I have been fascinated by music of word in any language and in this collection of verses I have sought to make the words sing the music that I hear.

"But, as lyric poetry is poetry as well as being lyrical, it has the same general purpose as poetry, which is the expression of the deepest

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

feelings of the human heart in the search for beauty and the mystery of things. It is perhaps primarily a search for Beauty."

غور سے دیکھا جائے تو اس مفہوم میں سورلے شاعری کے ایسے تراجم کو صحیح قرار نہیں دیتا جن کے ذریعے صرف الفاظ کے معنی دوسری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علامہ امداد علی قاضی مرحوم بھی شاعری کے ایسے تراجم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ جو شعر گایا نہیں جاسکتا وہ شاعری نہیں ہے۔ غنائیہ شاعری کا مقصد بیان کرتے ہوئے۔ سورلے بھی لگ بھگ یہی بات کہتے ہیں۔ لکھتا ہے:

"Lyric poetry in fact takes for its province what in another connection Somerset Maugham had beautifully described as all that the world has to offer of beauty, Love and ease, friendship and art the pleasant gifts of nature."

روایت ہے کہ گوئٹے کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو وہ "Light More Light" پکار رہے تھے۔ شاہ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو 'موسیقی اور موسیقی' طلب کر رہے تھے۔ کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ خود کو ایک حجرے میں بند کر دیا تھا۔ بقول ڈاکٹر گربخشانی: "اگر کچھ دیر حجرے سے باہر نکلتے تو روکھی سوکھی روٹی کا بمشکل ایک آدھ نوالا اور پانی کا گھونٹ لیتے اور پھر حجرے میں بند ہونے سے پہلے صدا دیتے------ "موسیقی!"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہتے ہیں کہ مسلسل تین دن رات محفل موسیقی جاری رہی۔ جب آپ حجرے سے باہر نہیں نکلے تو فقراء کو تشویش ہوئی۔ ادب سے اندر داخل ہوئے، دیکھا کہ آپ کی روح قفس خاکی سے نکل کر مالک حقیقی سے جا ملی ہے۔

اسلامی دنیا میں بہت سے عظیم صوفیا موسیقی اور سماع سے رغبت رکھتے تھے۔ جلال الدین رومی، معین الدین چشتی، شاہ حسین، بلھے شاہ، سلطان باہو اور سچل سرمست کے اسمائے گرامی ان میں سر فہرست ہیں۔ فخر الدین عراقی جب حضرت غوث بہاء الحق ملتانی کی صحبت میں رہتے تھے تو ایک بار مریدوں نے غوث کو اطلاع دی کہ عراقی کچھ اشعار گنگنا رہا ہے۔ غوث کے استفسار پر عراقی نے غزل سنائی۔ جب یہ شعر پڑھا کہ:

بعالم ہر کجا درد و غمے بود
بہم کردند و عشق اش نام کردند

تو راویت ہے کہ غوث العالمین کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

شاہ کے کلام میں اس قدر غنائیت ہے کہ اسے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہے۔ شاہ کی موسیقی سے محبت کے متعلق کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ایک بار سندھ کے دارالخلافہ ٹھٹھہ سے مذہبی علماء آپ کے پاس آئے اور موسیقی سے منع فرمایا کہ شرعاً" ممنوع ہے۔ شاہ نے بڑے عجز سے جواب دیا: "میرے دل کے اندر پھولوں کا ایک بوٹا ہے، جب میں موسیقی نہیں سنتا تو پھول مرجھا جاتے ہیں۔"

سورلے نے "Musa Parvagunis" میں یونانی، لاتینی کلاسیکی اور عہد وسطی کی لاتینی سے نو (۹) شعراء کو شامل کیا۔ فرینچ سے وکٹر ھیوگو، عربی (اندلس) سے ابن زیدون، سندھی سے شاہ عبداللطیف بھٹائی اور اردو سے علامہ اقبال۔ ان عظیم شعراء کے منتخبات منظوم انگریزی تراجم کے ساتھ اپنی کتاب میں دیے۔ نیز ہر شاعر کا مختصر تعارف دیا اور لکھا کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"The earliest of the poets whom I have translated is Tyrtaeus, who according to suidas, flourished in the 37th olymaid, which puts him about the middle of the 7th century B.C. The lastest poet is Iqbal, the esteemed poet of modern Pakistan, who died in 1938 and within the memory of most people who may think it worth while to read this book.

انہوں نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھا:

"It may be asked where are my preferences in this pageant of the lyric and wondering muse. In literature preferences are always a matter of taste. It is rarely fair in dealing with the works of supreme poetical skill to attempt to say that one is greater than another. Men will always differ in appraisement of that kind. It is well it should be so. But to me in this gathering of excerpts from the works of thirteen real poets speaking six different language, the first place goes to Shah

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Abdul Latif of Sindh, in whose verse it is impossible not to detect the music and acstasy of sublime adoration.

سورلے کو ہندی شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے "سرد۔ ہندو۔ منطق" سخت ناپسند تھا۔ بنابریں اس نے کتاب میں کسی ہندو شاعر کو شامل نہیں کیا تھا۔ درحقیقت سولے کو نہ صرف عربی زبان سے عقیدت تھی بلکہ اس نے عیسائی اور اسلامی تصوف کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔

"There are no Hindu poets in my collection. Their thought runs on a very different plane which to me offers only the cold intellectualism that characterises the higher flights of the Hindu religion. The only Hindu poetry of the highest class that has appealed to me to some slight extent is that of the Sikh religion, where in places the form of mystic contemplation is at times close to what is found in Christianity and islam, a fact which, I think, explains the strange fascination that a completely Islamic poet like Shah Abdul Latif of Sindh has excercised over

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

both Muslimes and Hindues familiar with his autstanding achievements.

شاہ کے کلیات کو سندھی زبان میں "شاہ جو رسالو" "Message of Shah" کہتے ہیں۔ "شاہ جو رسالو" کے جتنے قدیم نسخے اب تک دریافت ہوئے ہیں وہ آپ کی وفات کے بعد لکھے گئے ہیں۔ سندھ میں چھاپہ خانے برطانوی دور حکومت میں قائم ہوئے۔ شاہ جو رسالو پہلے جرمنی سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ یہ علمی کارنامہ ایک جرمن عالم' ڈاکٹر ارنیسٹ ٹرمپ نے سرانجام دیا۔ موصوف نے سندھی زبان کی ٹائپ بطور خاص بنوائی تھی۔ ٹرمپ نے سندھی زبان کی ایک گرامر بھی چھپوائی۔ ٹرمپ کی زندگی پر حال ہی میں ڈاکٹر شمل نے ایک تحقیقی مقالہ انگریزی میں شائع کیا ہے۔

شاہ جو رسالو کے اب تک تقریباً چالیس ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں جو مختلف عالموں نے مرتب کئے ہیں۔ ان سب میں ڈاکٹر گربخشانی کے ایڈیشن کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ سندھ کے مورخ پیر حسام الدین راشدی نے مجھے بتایا: "جدید مغربی طرز پر سندھی زبان میں تحقیق اور تدوین کا فن دو کتابوں کی اشاعت کے بعد رائج ہوا۔ ایک ڈاکٹر گربخشانی کا مرتب کردہ "شاہ جو رسالو" دوسری ڈاکٹر داؤد پوتہ کی مرتب کردہ "میر معصوم کی تاریخ سندھ۔"

ڈاکٹر گربخشانی' ڈی جے کالج کراچی میں پروفیسر تھے۔ فارسی زبان کے ماہر تھے۔ آپ نے شاہ جو رسالو کے علاوہ دو اور کتابیں لکھیں: ایک "لنواری جا لال" دوسری "نور جہاں" لنواری جنوبی سندھ میں ایک قصبہ ہے۔ مذکورہ کتاب میں وہاں کے بزرگوں خواجہ محمد زبان اور ان کے خاندان کے مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ دوسری کتاب جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کی سوانح ہے جو ناول کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر گربخشانی "شاہ جو رسالو" ہی کی وجہ سے آسمان سندھ پر چودھویں کے چاند بن کر چمکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر گربخشانی نے شاہ جو رسالو پر بے انتہا محنت کی۔ کلام کا مستند متن (Text) تیار کرنے کے لیے آپ نے کئی ایک قلمی نسخوں کا موازنہ (Colletion) کیا جو محنت اور توجہ طلب کام تھا۔ مکمل متن تیار ہونے کے بعد ضخامت کے لحاظ سے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ (تاکہ ان کو چار جلدوں میں چھاپا جائے) ہر حصے کے آخر میں حواشی اور تعلیقات دیے۔ شاہ کے کلام میں جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات کے علاوہ رومی، حافظ، میراں بائی، کبیر اور بابا فرید کے اشعار پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر گربخشانی نے حواشی میں ان کے معنی اور عالمانہ تفسیر و شرح لکھی۔ شاہ نے جتنی عوامی داستانیں بیان کی ہیں ڈاکٹر گربخشانی نے ان کے متعلق سندھ میں رائج تمام روایات کو جمع کیا اور تعلیقات و حواشی میں شامل کیا۔ جلد اول کے آغاز میں "مقدمہ لطیفی" کے عنوان سے جامع مقدمہ لکھا جو ایک ادبی دستاویز ہے۔ مقدمہ میں آپ نے شاہ کی صورت، سیرت اور زندگی کے تمام اہم واقعات پر روشنی ڈالی۔ نیز شاہ کے فلسفہ حیات پر اسلامی تصوف اور ویدانت کے حوالے سے عالمانہ بحث کی۔ غرض کہ ڈاکٹر گربخشانی نے ایک ایسا شاہکار پیش کیا جس کی مثال سندھ آج تک پیش نہیں کرسکا۔

ڈاکٹر گربخشانی کے مرتب کردہ شاہ جو رسالو کی تین جلدیں شائع ہوگئیں لیکن چوتھی جلد آپ کی زندگی کے نامساعد حالات کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ موصوف آزادی کے بعد ہندوستان ہجرت کرگئے اور وہیں وفات پائی۔

ڈاکٹر گربخشانی ایک بیحد خلیق انسان، اعلیٰ پائے کے انشاء پرداز عالم اور محقق تھے۔ مذہبی تعصب سے پاک تھے۔ عقیدے کے لحاظ سے تصوف کی طرف مائل تھے۔ شاہ کے ہمعصر اور لنواری کے جلیل القدر عالم اور عارف باللہ خواجہ محمد زمان کے سلسلہ رشد و ہدایت سے مستفیض ہوئے تھے۔ سندھ کے علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر گربخشانی کا اسم گرامی از حد ادب اور احترام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے لیا جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء میں حکومت سندھ نے سندھی ادب اور ثقافت کی ترقی اور ترویج کے لیے تین ادارے قائم کیے۔ ان میں ایک ادارہ خاص طور پر شاہ عبداللطیف بھٹائی پر تحقیق کے لیے قائم ہوا جبکہ دوسرے دو ادارے تھے۔ سندھی ادبی بورڈ اور سندھ پراونشل لائبریری اور میوزیم۔

تحقیقاتی مرکز شاہ کی ابدی آرام گاہ بھٹ شاہ ہی میں قائم ہوا۔ اہل تحقیق کی آسانی کے لیے ایک آرام دہ ہاسٹل اور لائبریری کا قیام بھی عمل میں آیا۔ نیز سیمینار اور کانفرنس کے لیے ایک آڈیٹوریم بھی تعمیر ہوا۔ غالباً پاکستان کے کسی دوسرے صوبہ میں بھٹ شاہ جیسا مرکز نہیں ہے جہاں کوئی محقق خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، سلطان باہو، شاہ حسین، بھلے شاہ، فرید گنج شکر، خواجہ غلام فرید، جام درک یا مست توکلی پر کوئی تحقیقی کام کرسکے۔ گویا حکومت سندھ نے دیگر صوبائی حکومتوں کے لیے بھی ایک مثال قائم کی کہ وہ بھی اپنے شعراء اور مشاہیر کے لیے ایسے مراکز قائم کریں۔ خوش قسمتی سے صوبہ سرحد کی حکومت نے حال ہی میں رحمان بابا کا مپلیکس کی تعمیر کا کام شروع کردیا ہے جو قابل تعریف کارنامہ ہے۔

بھٹ شاہ تحقیقاتی مرکز نے سالانہ کانفرنسوں میں پڑھے گئے مقالات کے علاوہ شاہ پر تحقیق کے لیے کچھ اہم کتابیں شائع کیں ہیں اور متعدد پرانی نایاب کتابیں دوبارہ شائع کی ہیں۔ بھٹ شاہ تحقیقاتی مرکز کے علاوہ جن دیگر سرکاری اداروں نے شاہ کی حیات اور کلام پر تحقیقاتی اور اشاعتی کام کیا ہے ان میں سندھی ادبی بورڈ سرفہرست ہے۔ بورڈ نے اپنے پروگرام میں شاہ کے مکمل کلام کا مستند متن (Authentic Text) مرتب کرنے کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔

شاہ کا کلام ان کی زندگی میں جمع نہیں ہوا تھا۔ بعد میں آپ کے کلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے جتنے بھی قلمی نسخے مرتب ہوئے ان کی بنیاد زبانی روایات تھیں۔ شاہ اور دوسرے شعراء کا کلام سندھ کے طول و عرض میں گایا جاتا ہے۔ اکثر گانے والے شاہ کی شہرت کی وجہ سے دوسرے شعراء کے کلام میں بھی شاہ کا نام ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ جتنے بھی پرانے سے پرانے قلمی نسخے ملتے ہیں ان میں شاہ کے کلام کے ساتھ دوسرے شعراء کا کلام بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے ایسی کئی مثالیں ثبوت کے ساتھ پیش کی ہیں۔ بنا بریں سندھی ادبی بورڈ نے سوچ بچار کے بعد شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ سے استدعا کی کہ شاہ کے کلام کا مستند متن تیار کریں۔

۱۔ آپ ڈاکٹر گربخشانی کے تلمیذ رشید تھے اور "شاہ جو رسالو" کی تالیف میں موصوف کا ہاتھ بٹایا تھا جس کا اعتراف انہوں نے بڑی محبت سے کیا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب نے سندھ کے عوامی شعراء کا کلام جمع کیا تھا اور "سرھا گل" (مہکتے پھول) کے نام سے شائع کیا تھا۔

۳۔ آپ نے شاہ کے جدامجد شاہ عبدالکریم کا کلام جمع کیا تھا اور نہایت خوبصورتی سے شائع کیا تھا۔

۴۔ آپ نے میر معصوم کی تاریخ سندھ کو ایسے عالمانہ انداز سے ایڈٹ کیا تھا کہ بڑے بڑے عالم آپ کی علمی عظمت کے قائل ہو گئے تھے۔

۵۔ آپ کو عربی اور فارسی ادبیات پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ ابوالکلام آزاد جیسے یگانہ روزگار دانش مند بھی آپ کے معترف تھے۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ نے بورڈ کی پیشکش قبول کی اور مطالبہ کیا کہ مجوزہ منصوبہ کی تکمیل کے لیے سندھ اور بیرون سندھ سے شاہ جو رسالو کے زیادہ سے زیادہ قلمی نسخے حاصل کر کے ان کو دیئے جائیں۔ بورڈ نے تقریباً تیس قلمی نسخے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمع کر کے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجے۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے مطبوعہ نسخے کو اساس بنایا اور مختلف قلمی نسخوں کا تقابلی جائزہ (Collation) شروع کیا تاکہ ان کے مابین جو فرق ہے وہ واضح ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب اعلیٰ پائے کے محقق، انتہائی ایماندار اور جفاکش تھے۔ جس کام کو ہاتھ میں لیتے، اس کی جزئیات تک کو بھی درست کر دیتے۔ موصوف دن رات محنت اور لگن سے اپنا کام کر رہے تھے کہ اچانک عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کا مسودہ ان کے احباب اور لواحقین کے مشورے سے بقیہ کام کی تکمیل کے لیے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کو تفویض کیا گیا۔ قاسمی صاحب نے یہ پیشکش بخوشی قبول فرمائی اور بڑے جذبے سے کام شروع کیا، لیکن کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کی کوشش بار آور نہ ہوئی۔ شاہ کے کلام کا مستند متن تیار کرنے کا منصوبہ مکمل نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ ایک زمانے میں ڈاکٹر آف پبلک انسٹرکشن سندھ کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اس زمانے میں مرحوم عثمان علی انصاری آپ کے نائب تھے جو خود ایک عالم اور محقق تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ شاہ کے کلام سے شغف رکھتے تھے۔ ایک عرصے سے شاہ کے کلام کا مستند نسخہ تیار کرنے کے لیے خاموشی سے تحقیق کر رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ کے لیے سندھی ادبی بورڈ کے اعزازی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ جب وفات پائی تو آپ کے لواحقین نے مرحوم کا تیار کیا ہوا مسودہ بورڈ کے حوالے کیا۔ مسودہ ہر طرح سے طباعت کے لیے مکمل تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مرحوم نے بورڈ سے منسلک ہوتے ہوئے بھی خود اس کی طباعت کا اہتمام نہیں کیا۔ تقدیر کو شاید یہی منظور تھا کہ بورد میں آنے والی انتظامی تبدیلیوں کے باعث مسودہ چھپنے سے رہ گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سندھی ادبی بورڈ کو جتنے بلند پایہ عالموں اور دانشوروں کا ساتھ نصیب ہوا اتنا اور کسی ادارے کو نہیں ہوا۔ سن ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک دس سال کا عرصہ تو بورڈ کا سنہری دور تھا۔ علامہ آئی آئی قاضی، شمس العلماء داؤد پوتہ، عثمان علی انصاری، پیر علی محمد راشدی، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سید غلام مصطفیٰ شاہ، آغا عبدالنبی، سید میراں محمد شاہ، مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ، آپا اے کے شیخ، ڈاکٹر غلام حسین جعفری، ڈاکٹر ھالی پوتہ، اللہ بخش نظامانی اور آغا بدرالدین درانی جیسے مشاہیر، ادارے کے بورڈ آف گورنرز سے وابستہ تھے۔ محمد ایوب کھوڑو وزیر اعلیٰ سندھ اور سید غلام مرتضیٰ شاہ بورڈ کے صدر اور نائب صدر تھے۔ انتظامی سربراہ (Chief Executive) جناب محمد ابراہیم جویو تھے۔ سراج الحق میمن اور راقم الحروف آپ کے ماتحت تھے۔ مرحوم محمد عثمان ڈیپلائی اور مولانا غلام محمد گرامی سہ ماہی رسالے "مہران" کے مدیر تھے۔

علامہ امداد علی قاضی کی شخصیت سب سے ممتاز اور منفرد تھی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے مجھ سے کہا: "انیسویں صدی میں برصغیر پاک و ہند نے تین ایسے مسلمان عالم پیدا کیے جو مغرب کو بیسویں صدی کی اصطلاح میں خطاب (Address) کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ایک علامہ مشرقی، دوسرے علامہ اقبال اور تیسرے علامہ امداد علی قاضی۔"

قاضی صاحب کے برصغیر کے مسلم مشاہیر کے ساتھ قریبی مراسم تھے۔ جب آپ نے وفات پائی تو ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات کے باوجود سب سے پہلے ہندوستان کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کا آل انڈیا ریڈیو سے تعزیتی بیان نشر ہوا۔ موصوف قاضی صاحب کے بڑے عقیدت مند تھے۔ جب قاضی صاحب لندن میں رہائش پذیر تھے اور برصغیر پر انگریز حکومت کر رہے تھے تو وہ دیگر مسلمان مشاہیر کی طرح قاضی صاحب کے نہایت قریب تھے۔ میں نے قاضی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب کے پاس ان (ڈاکٹر ذاکر حسین) کا ایک خط دیکھا تھا جس میں انہوں نے قاضی صاحب کے لیے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا تھا۔

قاضی صاحب نے اسلامی یونیورسٹی الازہر اور یورپ کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد ازاں لندن ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ربع صدی تک وہاں رہے۔ آخری عمر میں اکابرین سندھ کے اصرار پر سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو استعفیٰ دے دیا۔ سندھی ادبی بورڈ کے صدر (مرحوم) محمد ایوب کھوڑو (جو وزیر اعلیٰ سندھ اور وزیر دفاع حکومت پاکستان رہ چکے تھے) یہ خبر سن کر فوراً آپ کے پاس گئے اور گزارش کی کہ شاہ کو بیرون سندھ متعارف کرانے کے لیے انگریزی میں ایک کتاب لکھیں۔

قاضی صاحب نے یہ پیش کش قبول فرمائی۔ آپ نے "شاہ جو رسالو" کا ایک ایڈیشن ترتیب دیا اور اپنی جرمن نژاد اہلیہ ایلسا قاضی کو جو خود بلند پایہ شاعر، مصور اور موسیقار تھیں، شاہ کے چھ سو منتخب اشعار کا منظوم انگریزی ترجمہ کرنے میں مدد دی۔ آپ نے اس ترجمے کا عالمانہ مقدمہ لکھا جو ترجمے کے ساتھ بھی شائع ہوا ہے اور الگ کتابی صورت میں بھی۔

قاضی صاحب علمی ادبی اور مذہبی مسائل پر مجالس منعقد کیا کرتے تھے اور شاہ اور غزالی کے حوالے اکثر دیا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں آپ جناح کورٹس کی جامع مسجد میں خطبے دیتے تھے۔ جب آپ نے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا تو خطبات کا سلسلہ پھر سے شروع گیا۔ ہر جمعہ کو حیدر آباد میں یونیورسٹی اولڈ کیمپس کا سینٹ ہال آپ کو سننے کے لیے بھر جاتا تھا۔ تل بھر جگہ خالی نہ ہوتی تھی۔ قاضی صاحب اپنے خطبات اکثر انگریزی میں دیتے تھے جن میں قرآن کریم کی آیات اور شاہ کے اشعار کثرت سے پڑھتے تھے۔

ایک بار قاضی صاحب خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے سوال کیا کہ "شاہ کے کلام کی کسوٹی کیا ہے؟" قاضی صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ "جو شعر قرآن اور حدیث کے مطابق ہو' وہ شاہ کا ہے اور جس میں اختلاف نظر آئے وہ شاہ کا نہیں ہے۔"

چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قاضی صاحب شاہ کو ان شعراء میں شمار کرتے تھے جو حدیث نبویؐ کے مطابق "تلامیذ الرحمان" کے زمرے میں آتے ہیں۔ شاعری ان کے لیے صرف پیغام پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب کی اہلیہ نے شاہ کے کلام کا منظوم انگریزی ترجمہ مکمل کرنے کے بعد قرآن کریم کے حوالے سے ایک شعر کہا:

قدرت نے ہر قوم کو ہادی اور رہبر بھیجے
جب سندھ کی باری آئی تو اس نے شاہ کی انگلی پکڑی

قاضی صاحب کا مرتب کیا ہوا شاہ جو رسالو (سندھی) اور منظوم انگریزی ترجمہ دونوں سندھی ادبی بورڈ نے شائع کئے ہیں' ان پر شاہ کے اردو مترجم جناب شیخ ایاز نے اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے اپنے منظوم اردو ترجمے کے مقدمے میں کہا ہے:

"اس دور کے بڑے بزرگ اور قابل صد احترام عالم حضرت علامہ آئی آئی قاضی صاحب سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی اور ان کی جامع صفات و کمالات اہلیہ محترمہ ایلسا قاضی صاحبہ نے حال ہی میں شاہ کے کلام کا ایک مستند اور معتبر متن (Text) ترتیب دے کر اور شاہ کے منتخب کلام کا انگریزی منظوم ترجمہ ایک عالمانہ تنقیدی تعارف کے ساتھ پیش کر کے ایک تاریخی کام سرانجام دیا ہے جس کے لیے سندھی ادب اور سندھی ثقافت کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کے اصحاب نقد و نظر ان کے گرویدہ احسان رہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گے۔

قاضی صاحب کے عقیدت مندوں میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا اسم گرامی سرفہرست آتا ہے۔ آپ موجودہ دور میں سندھ کی ممتاز علمی شخصیت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ادب' لغت' لسانیات' لوک ادب' تاریخ' آثار قدیمہ اور دیگر شعبوں میں گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ جب آپ نے تعلیم ختم کی تو حکومت پاکستان نے آپ کو سفارتکار کے اعلیٰ عہدے کی پیشکش کی لیکن قاضی صاحب کے ارشاد پر آپ نے سندھ یونیورسٹی میں ملازمت کو ترجیح دی۔ بعد میں اسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور وفاقی حکومت میں بھی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی اصل پہچان آپ کا علمی و ادبی کام ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے ہم عصر ادیبوں اور محققوں سے ان معنوں میں یکسر منفرد ہیں کہ ادب اور لسانیات کے مسائل ہوں یا تاریخ اور آثار قدیمہ کے' آپ صرف کتابوں کا مطالعہ کرنے اور رائے قائم کرنے کے بجائے تاریخی مقامات کا خود دورہ کرتے ہیں اور بعد میں اپنے مشاہدے اور مطالعے کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتے ہیں۔

شاہ نے زندگی کا اچھا خاصا حصہ سفر میں گزارا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہ مقامات دیکھے ہیں۔ سندھ کے گاؤں گاؤں میں عوامی داستان گو اور شاعر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس کلام کا جو ذخیرہ تھا وہ شاہ کا تھا یا کسی اور شاعر کا' ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت سے اسے جمع کیا اور سندھی ادبی بورڈ کے لوک ادب کے منصوبے کے تحت متعدد جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ان میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جو آپ نے بورڈ یا دیگر اداروں کے مختلف منصوبوں کے تحت شائع کی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ ایک عرصہ سے شاہ کے کلام کا جامع اور مستند متن تیار کرنے کے لیے ایک منصوبہ پر بھی کام کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی تحقیق کا کافی حصہ شائع کر چکے ہیں۔ نیز شاہ کے کلام کا سنہ ۱۲۰۶ھ میں تصنیف کیا ہوا ایک نایاب نسخہ شائع کر چکے ہیں جو اب تک معلوم تمام قلمی نسخوں میں قدیم ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی موسیقی کی روایات کا بھی خاص طور پر شاہ کے کلام کے حوالے سے عمیق مطالعہ کیا ہے۔ آپ نے کئی برس سندھ کی تاریخ اور ادب کا جو مطالعہ کیا ہے اس کی بناء پر بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ شاہ کی زندگی اور پیغام پر آپ کی تحقیق سندھی ادب کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی۔

شاہ کے کلام اور پیغام پر تحقیقی کام سندھ اور بیرون سندھ جاری ہے۔ سرکاری اداروں اور ان سے وابستہ محققوں کے علاوہ کئی ایک عقیدت مند شاہ کے کلام پر خانگی طور پر بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ اس کی تفصیل یہاں پیش کرنا ممکن نہیں۔ قیام پاکستان سے قبل مولوی ہدایت اللہ مرحوم نے آپ کے کلام کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا، جو چھپنے سے پہلے شائع ہوگیا۔ حال ہی میں میرے دوست ڈاکٹر افضل الرحیم سومرو نے شاہ کے مکمل کلام کا عربی زبان میں ترجمہ کیا اور متعدد جلدوں میں خود ہی شائع کیا۔ جنوبی سندھ کے ایک چھوٹے سے قصبے دڑو میں عبدالغفور میمن شاہ کے کلام پر ایک عرصے سے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ کچھ کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ سندھ کے نامور ماہر تعلیم پروفیسر محمد اکرم انصاری نے انگریزی میں ایک بہت عمدہ کتاب شائع کی ہے۔

عہد جدید کے مستشرقین میں ڈاکٹر این میری شمل کا نام سرفہرست ہے۔ یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سورلے کے علاوہ شاہ پر تحقیقی کام کرنے والے تینوں یورپی عالم یعنی ارنیسٹ ٹرمپ، ایلسا قاضی اور ڈاکٹر شمل، جرمن نژاد ہیں، موخر الذکر نے شاہ کے کلام کا انتخاب جرمن زبان میں شائع کیا ہے۔ نیز انگریزی زبان میں شاہ اور خواجہ میر درد پر ایک نہایت عمدہ کتاب "Grace

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Pain and" کے نام سے یورپ میں شائع کی ہے۔

ہماری قومی زبان اردو میں شاہ پر نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے۔ چند متفرق مضامین اور انگریزی تراجم سے ترجمہ کرنے کی انفرادی کوششوں کے علاوہ جو اہم کام ہوا ہے' وہ ہے رسالہ کا مکمل منظوم ترجمہ جو سندھ یونیورسٹی اور وزارت تعلیم' حکومت پاکستان کی سعی و اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ سندھ کے باکمال شاعر شیخ ایاز نے کیا ہے۔ جن دنوں آپ یہ ترجمہ کر رہے تھے ان دنوں اس خاکسار کی ان سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں' جن میں ادبی مسائل زیر بحث آتے تھے۔

ایک دفعہ آپ آدھی رات تک صرف شاہ ہی پر گفتگو کرتے رہے۔ اچانک بجلی غائب ہوگئی لیکن موصوف کی گرمی گفتار میں کمی نہیں آئی۔ کتب خانے میں گئے۔ اندھیرے میں کافی تلاش کے بعد گربخشانی کا ایک نسخہ تلاش کر کے لائے اور میرے سامنے رکھا۔ میں نے شمع کی روشنی میں دیکھا کہ اس کے ایک ایک صفحہ پر آپ نے بڑی محنت سے بے شمار نوٹس لئے تھے۔ درحقیقت اپنے اردو ترجمہ کے لیے انہوں نے اسی نسخے کو اساس بنایا۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد موصوف نے ان تمام اصحاب کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس اہم کام میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا:

> "شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مجموعہ کلام کے اس اردو ترجمہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں پیر حسام الدین راشدی صاحب' ابراہیم جویو صاحب' مخدوم امیر احمد صاحب' حفیظ ہوشیارپوری صاحب اور عزیزی آفاق صدیقی صاحب نے مجھے بڑی مدد دی۔ راشدی صاحب کا گرانقدر مشفقانہ تعاون اور جویو صاحب کا پرخلوص مشورہ ہر منزل پر مجھے حاصل رہا اور دونوں حضرات کے اشتراک عمل سے یہ مشکل کام پایہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تکمیل کو پہنچا۔ محبی آفاق صدیقی صاحب نے سندھی ادب سے دلی وابستگی کے بناء پر میرا ہاتھ بٹانے میں جتنی محنت کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ مخدوم امیر احمد نے نثری ترجمہ بہم پہنچانے اور حفیظ ہوشیارپوری صاحب نے منظوم ترجمہ پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کی جس کے لیے میں ان دونوں حضرات کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ سندھی زبان و ادب کے جن محققین کی ماہ ناز تصانیف سے میں نے استفادہ کیا ہے' ان میں ڈاکٹر سورلے صاحب' ڈاکٹر گربخشانی صاحب' ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب' مولانا دین محمد وفائی صاحب' پروفیسر جھمٹ مل صاحب' جی ایم سید صاحب اور دور حاضر کے مشہور و معروف محقق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"

شاہ کے کلام کا یہ ترجمہ سندھ یونیورسٹی نے جون ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا۔ تیس سال بعد سن ۱۹۹۲ء میں لوک ورثہ' اسلام آباد نے دوسرا منظوم اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ جناب آغا سلیم نے کیا ہے۔ آپ عہد جدید کے ممتاز سندھی ادیب ہیں اور ایک عرصہ تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے ہیں۔ راگ ودیا کا علم رکھتے ہیں۔ فاضل مترجم نے شاہ کے حالات زندگی پر ایک باب "بھٹ شاہ پر شاہ سائین کے راگ کی ابتداء" کے عنوان سے لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بااصول مصنف اور شاہ کے سچے عقیدت مند کی حیثیت سے آپ نے پوری پوری کوشش کی ہے کہ شاہ کے کلام میں جو غنائیت ہے وہ اردو ترجمہ میں برقرار رہے۔ آپ کے ترجمہ کو سندھ کے علمی حلقوں میں پسند کیا جاتا ہے۔

سندھ کے کئی اور ادیبوں نے مختلف زاویوں سے شاہ کی زندگی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کلام پر تحقیق کی ہے' ان میں سرفہرست مولوی دین محمد وفائی کا نام آتا ہے۔ آپ کی کتاب "شاہ کا مطالعہ" کے نام سے چھپی تھی۔ حال ہی میں اس سلسلے کی تین اور اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں: ایک تنویر عباسی کی "شاہ لطیف کی شاعری" دوسری آفتاب ابڑو کی "شاہ کی بولی" یہ دونوں کتابیں شاہ لطیف ثقافتی کونسل نے شائع کی ہیں جو شاہ پر متعدد کانفرنسیں بھی منعقد کر چکی ہے۔

تیسری کتاب انگریزی زبان میں ہے جس کی مصنفہ درشہوار سیدہ صاحبہ کراچی یونیورسٹی میں شاہ عبداللطیف چیئر کی ڈائریکٹر ہیں۔ آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئی تھیں۔ جہاں آپ نے ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لیے "Poetry of Shah Abdul Latif" کے نام سے مقالہ لکھا' انگریزی زبان میں ایک اور اہم کتاب مرحوم جی۔ الانا صاحب کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔

لیکن شاہ پر تازہ ترین تحقیقی کام غالباً شکارپور کے آغا محمد یعقوب کا ہے جو بھٹ شاہ تحقیقی مرکز نے شائع کیا ہے "Shah Jo Risalo Alias Ganje Latif" نام سے یہ کتاب بھٹ شاہ ثقافتی مرکز نے ۱۹۸۸ء میں شائع کی ہے۔ فاضل مترجم نے ترجمے کے ساتھ تفصیلی حاشیہ دیا ہے اور پیش لفظ میں لکھا ہے:

> "I prepared a fairly large dictionary of difficult words of Risalo in the colloquil Sindhi and English. It contains more than 6000 (Six thousand) words. I hope it will be quite useful to the students of Risalo. I must state here that the Risalo is almost untranslatable, due

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

to the poet's high spiritual philosophy."

ہمیں اس حقیقت کو قبول کرنے سے گریز کرنا نہیں چاہیے کہ کسی بھی زبان کے شعر کا دوسری زبان میں منظوم ترجمہ ناممکن ہے۔ رباعیات عمر خیام کے منظوم انگریزی ترجمے کی دنیا بھر میں شہرت ہے۔ عالمی ادب کے نقادوں نے فزجرالڈ کو Original Poet کا درجہ دیا ہے۔ تاہم فارسی ادب کے اساتذہ اس بات پر مصر ہیں کہ فاضل مترجم نے خیام کے ترجمہ کا حق ادا نہیں کیا۔ البتہ اپنی بات خوبصورت الفاظ میں بیان کر دی ہے۔

شاہ کے کلام کی جڑیں سرزمین سندھ، اس کی زبان، تہذیب اور ثقافت میں اس قدر پیوستہ ہیں کہ اس کو کسی بھی دوسری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش سے اس کا شعری حسن تحلیل ہو جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ بات ہم تمام کلاسیکی سندھی شعراء کے سلسلے میں کہہ سکتے ہیں۔ افسوس! بات لمبی ہو گئی لیکن شاہ کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، ابھی کہہ نہیں سکا۔

زباں ز نطق فروماند و راز من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

* * *

© rasailojaraid.com